بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

"حقوقِ نسواں کمیٹی برائے پاکستان" خلع کے پردے میں جس طرح کا غیر مقیّد اور بے دریغ "حق طلاق" عورت کو دینا چاہتی ہے اور طلاق کے بعد جس طرح مطلقہ کو طلاق دہندہ کی جائداد منقولہ و غیر منقولہ میں حصہ دار بنانا چاہتی ہے، اس پر ترجمان کے دو سابق شماروں میں ضروری بحث کی جا چکی ہے اور دلائل و براہین سے یہ امر واضح کیا جا چکا ہے کہ یہ دونوں سفارشیں کتاب و سنّت کی تعلیمات اور عقل و انصاف کے مقتضیات سے کس قدر دُور ہٹی ہوئی ہیں۔ یہ دراصل مغربی تہذیب و تمدن سے مفتوح و مغلوب ذہن کی پیداوار ہیں، ان سے مسلمانوں کے ازدواجی مسائل و مشکلات میں سے کوئی مشکل آسان نہیں ہو سکے گی، البتہ فرنگی اقوام کے طور طریقوں کو یہاں رائج کرنے میں ضرور مدد ملے گی۔ اب تک کی بحث میں رپورٹ کی دفعہ ۴۰ تک کا جائزہ لیا جا چکا ہے۔ اب ہم اس سفارش کو لیتے ہیں جو دفعات ۴۱، ۴۲، ۴۳ میں تجویز کی گئی ہے۔ اس سفارش کا ترجمہ درج ذیل ہے:

"کمیٹی یہ محسوس کرتی ہے کہ طلاق کے بعد اپنی بیوی کو نان و نفقہ دینے کی شوہر کی ذمہ داری "عدت" کا زمانہ گزرنے کے بعد ختم نہیں ہونی چاہیے۔ جیسا کہ اس سے پہلے دیکھا گیا ہے کہ ایسی صورتیں ہیں جہاں سابق بیوی کے پاس کوئی علیحدہ و جداگانہ ذریعہ معاش نہیں ہوتا ہے۔ اور اس طرح "عدت" کا زمانہ گزرنے کے بعد اسے سنگین معاشی اور مالی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ موجودہ قانون کے تحت شوہر کو آزادی ہے کہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے خواہ وہ اس کے ساتھ کتنی ہی مدّت کے لیے رہ چکی ہو۔ عمر رسیدہ عورتوں کی صورت میں شوہر کی طرف سے استعمال کردہ طلاق کے حق کا نتیجہ واقعی سخت اذیّت کی صورت میں نکلتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس عمر میں اس کے لیے دوسری شادی کرنا ممکن نہ ہو اور اسی طرح اس کے لیے یہ بھی ممکن نہ ہو کہ اپنی معاش خود کمائے۔ کمیٹی کا خیال ہے کہ شوہر کی طرف سے طلاق کے حق کا خود اختیاری استعمال کسی حد تک روکا جا سکتا ہے اگر شوہر کو حکم دیا جائے کہ وہ ایک خاص مدت کے لیے اپنی سابق بیوی کا مالی بوجھ اُٹھائے۔

کمیٹی سفارش کرتی ہے کہ:

شوہر کی طرف سے طلاق کی صورت میں اسے حکم دیا جائے کہ عدت کے زمانے کے علاوہ شادی شدہ زندگی کے ہر سال کے لیے ایک ماہ کے حساب سے شمار کی جانے والی مدت کے لیے اپنی سابق زوجہ کو نان ونفقہ ادا کرے۔"

اس کمیٹی کی رپورٹ میں ایک عجیب چیز جو مشاہدے میں آرہی ہے وہ یہ ہے کہ پہلے وہ ایک انتہائی نادر الوقوع صورت فرض لیتی ہے جس میں خاوند بڑا ظالم وسنگدل اور بیوی بے حد مظلوم ومعصوم دکھائی دیتی ہے اور پھر اس صورت کو ایک عامۃ الورود اور آئے دن پیش آنے والا واقعہ قرار دے کر کمیٹی اس کے لیے ایک عام قانونی سفارش پیش کر دیتی ہے۔ چنانچہ دفعہ ۴۰ میں جب مطلقہ کو طلاق دہندہ کی جائداد میں حصہ دار بنانے کا مطالبہ کیا گیا تو اس کے لیے یہ دلیل دی گئی کہ:

"بعض اوقات شوہر کی طرف سے بستر مرگ پر بھی حق طلاق اس خیال کے پیش نظر استعمال کیا جاتا ہے کہ اس کی موت کے بعد بیوی کو اس کی جائداد میں سے حصہ کا دعویٰ کرنے سے محروم کر دیا جائے۔"

یہاں بستر مرگ پر طلاق دینے کی جو مثال دی گئی ہے وہ بالکل شاذ ونادر ہے اور اس سے جو نتیجہ اخذ کیا جا رہا ہے وہ قوانین شرعیہ سے بے خبری پر دلالت کر رہا ہے۔ اسلامی قانونِ وراثت کا یہ مسئلہ معروف ومسلم ہے کہ مرض الموت کی طلاق خواہ مغلظہ ہی کیوں نہ ہو وہ مطلقۂ معتدہ کو محروم الارث نہیں کر سکتی۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے اپنی اہلیہ کو ایسی طلاق دی تھی اور عدت گزرنے سے پہلے ان کا انتقال ہو گیا تو خلیفہ راشد حضرت عثمانؓ نے مطلقہ کو حضرت عبدالرحمٰنؓ کی میراث میں سے حصہ دلایا[1]۔ یہ مسئلہ صحابہ کرام کے مجمع عام میں پیش ہوا، اور سب نے اس سے اتفاق کیا۔ عورت کا یہ حقِ میراث صرف طلاقِ مریض تک محدود نہیں بلکہ فقہاء نے اس پر قیاس کر کے "طلاق الفار" میں بھی عورت کو وارث قرار دیا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ایک مرد قتل کے مقدمے میں ماخوذ ہے، یا دشمن سے لڑ رہا ہے، یا پُرخطر سفر پر روانہ ہو رہا ہے، یا کسی دوسرے

---

[1] موطا امام محمد اور بعض دیگر مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ کی وفات عدت گزر جانے کے بعد ہوئی۔ چنانچہ امام مالک اور بعض فقہاء اس صورت میں بھی وراثت کے قائل ہیں۔

مہلک حادثے کی زد میں ہے اور وہ عورت کو طلاق دے دیتا ہے تو یہ طلاق بھی عورت کے لیے مانعِ وراثت نہ ہوگی۔ اب کمیٹی کے معزز ارکان سے ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ بستر مرگ کی طلاق جب صحابہ کرام اور فقہائے اسلام کے اجماع کے مطابق مطلقہ کی وراثت پر اثر انداز نہیں ہو سکتی تو آپ مورث کی وفات سے پہلے ہی اس کی جائداد کے حصے بخرے کیوں کرنا چاہتے ہیں؟

بہرکیف خواتین پاکستان سے بے پناہ اور بے حساب ہمدردی و شفقت کا یہ کرشمہ ہے کہ کمیٹی نے مطلقہ کو سابق شوہر کی جائداد میں حصہ دار بنانے ہی پر بس نہیں کیا بلکہ مزید یہ بھی محسوس فرمایا کہ "طلاق کے بعد اپنی بیوی کو نان و نفقہ دینے کی شوہر کی ذمہ داری عدت کا زمانہ گزارنے کے بعد ختم نہیں ہونی چاہیے" (دفعہ ۴۱)۔ یہاں پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ طلاق دینے اور عدت گزر جانے کے بعد نان و نفقہ کی یہ ذمہ داری طلاق دینے والے پر ڈالنے کے لیے آخر شرعی یا عقلی بنیاد کیا ہے؟ "اپنی بیوی" اور "شوہر" کے الفاظ استعمال کر کے کیا یہ تاثر پیدا کرنا مقصود ہے کہ عدت کے بعد بھی رشتۂ ازدواج منقطع نہیں ہوا، اس لیے طلاق دینے والے کو مطلقہ کے اخراجات کا ایک حصہ ادا کرتے رہنا چاہیے؟ اگر فی الواقع ان تجاویز کے تحت یہی تصور کام کر رہا ہے تو ہم صاف طور پر کہیں گے کہ یہ ایک خالص ہندوانہ اور مسیحیانہ تصور ہے جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ہندوؤں اور عیسائیوں کے ہاں یہ نظریہ صدیوں تک رائج رہا ہے اور اس کے اثرات اب تک موجود ہیں کہ رشتۂ ازدواج دائمی اور ناقابلِ انقطاع ہے۔ اس لیے طلاق و تفریق کے باوجود سابق خاوند کو اس امر کا مکلف سمجھا گیا ہے کہ وہ اپنی مطلقہ کی ضروریاتِ زندگی فراہم کرتا رہے۔ مطلقہ کے ان اخراجاتِ پرورش کو مغربی ممالک میں ALIMONY کا نام دیا گیا ہے۔ ارکانِ کمیٹی نے غالباً بربنائے مصلحت اپنی اصل رپورٹ میں اس مغربی اصطلاح کے استعمال سے گریز کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مطلقہ کو طلاق دینے والے کی جائداد سے حصہ دلا کر اور حصہ دلانے کے بعد اس پر مطلقہ کے نفقہ کا مزید مالی بار عاید کر کے اسی غیر اسلامی تصور کی داغ بیل اسلامی معاشرے میں ڈالنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اگر ایک دفعہ یہ بنیاد پڑ گئی اور اس اصول کو تسلیم کر لیا گیا کہ وقوعِ طلاق اور انقضائے عدت کے بعد بھی مطلقہ کے اخراجاتِ حیات کا بار طلاق دینے والے پر ڈالا جا سکتا ہے تو اس کے بعد وہی سب کچھ ہوگا جو مغرب میں ہو رہا ہے اور جس کے نتیجے میں اکثر گھروں کا امن و سکون غارت ہو چکا ہے۔

مطلقہ کی پرورش MAINTENANCE کا یہ تخیل جو دیارِ مغرب میں مروج ہے اور جس کا چلن عام کرنے کی تجویز و تدبیر یہاں کی جا رہی ہے اس کا کوئی تعلق نان و نفقہ کی اُن صورتوں سے نہیں ہے جو اسلام میں معروف و مسنون ہیں۔ عورت جب تک خاوند کے نکاح میں ہے، اس کا نان و نفقہ فراہم کرنا خاوند پر فرض ہے خواہ عورت صاحبِ جائداد و املاک ہی کیوں نہ ہو۔ اگر مرد نفقہ فراہم نہ کرے تو عورت اسے بذریعہ قانون وصول کر سکتی ہے یا خاوند کے نام پر قرض لے سکتی ہے جس کی ادائیگی خاوند ہی کے ذمے ہوگی۔ اگر عورت کو خدانخواستہ طلاق ہو جائے تو وہ عدت کے دوران میں بھی خاوند ہی سے نفقہ لے گی۔ اگر وہ حاملہ ہے اور طلاق ہوئی ہے تو نہ صرف ایام حمل بلکہ بچے کی مدتِ شیر خوارگی کے ایام میں بھی زچہ و بچہ کے اخراجات بچے کے والد کے ذمے ہوں گے۔ والد کی جو اولاد بھی اس عورت سے ہوگی وہ دودھ چھڑانے کے بعد بھی اگر والدہ چاہے تو اپنی تحویل میں لے سکتی ہے۔ اگر لڑکا ہے تو وہ سات سال تک اور لڑکی ہے تو نو برس تک، یا ایک قول کے مطابق بالغہ ہونے تک اسے والدہ اپنے پاس رکھ سکتی ہے اور اس اولادِ صغار کے جملہ اخراجات والد ہی کے ذمہ ہوں گے۔ عورت صرف اُسی صورت میں اس حقِ حضانت سے محروم ہو سکتی ہے جبکہ وہ کسی ایسے مرد سے نکاح ثانی کرے جو اولاد کے لیے اجنبی اور غیر محرم ہو۔ اور سابق خاوند یہ مطالبہ کرے کہ میری اولاد مجھے واپس دلائی جائے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے بعد بھی مطلقہ کو سابق شوہر کی جائداد اور معاش میں مزید شریک بنانا کس اصول کے تحت جائز و روا ہو سکتا ہے؟

کمیٹی کی رپورٹ یہ کہتی ہے کہ فرض کیا عورت بوڑھی ہے اور بے اولاد بھی ہے، بڑھاپے میں اسے طلاق مل جاتی ہے تو اُس کا پُرسانِ حال کون ہوگا؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ جو عورت بے اولاد ہوگی (اور آپ عورتوں اور مردوں کو بانجھ بنانے کی پہلے ہی سعی فرما رہے ہیں) وہ مشکل ہی سے بڑھاپے تک ایک ہی خاوند کے پلّے بندھی رہے گی۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے پہلے نکاح کا جلد ازالہ ہو جائے اور وہ دوسرا نکاح کر لے۔ یا پھر میاں بیوی دونوں صابر و شاکر ہیں اور اپنی جوانی کو یکجا رفاقت کے ساتھ بڑھاپے میں تبدیل کرتے ہیں تو شاید ہی کوئی خاوند ایسا بُرا اور ناقدرا ہوگا جو ایسی بیوی کو جوانی میں تو نہیں مگر سن رسیدگی کے عالم میں طلاق دے گا۔ پھر بھی ہم مانے لیتے ہیں کہ ہمارے فاسد معاشرے میں ایسی صورتوں کا وقوع ممکن ہے اور یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسی بے سہارا عورتوں کی دستگیری کون کرے گا؟ مگر یہ سوال صرف بوڑھی بے اولاد مطلقات تک محدود نہیں

ہے بلکہ یہ سوال معاشرے کے ان تمام نادار و محتاج افراد کے بارے میں پیدا ہوتا ہے جن میں بچے، نوجوان، بوڑھے مرد، عورتیں سب شامل ہیں، جو معذور، بے کار اور بے یار و مددگار ہیں۔ اسلام ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ ایسے افراد کے اگر خوشحال عزیز اور قرابت دار موجود ہوں تو ان پر لازم ہے کہ وہ صلہ رحمی کے اصول پر اپنے ان رشتہ داروں کی کفالت کریں، اگر وہ نہ کریں تو بستی یا آبادی کے سب لوگ حسبِ استطاعت ان کی مدد کریں۔ اور یہ بھی نہ ہو تو اسلامی ریاست کی یہ ناگزیر ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے تمام غیر مستطیع شہریوں کی اعانت بیت المال سے کرے، جس پر ایسے تمام افراد کا یکساں حق ہے جو کسی عذرِ معقول کی بناء پر اپنی معاش کے حصول سے عاجز ہوں۔ لیکن جہاں تک ایک مطلقہ خاتون اور اس کے سابق شوہر کا تعلق ہے، عدّت گزر جانے کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے قطعاً اجنبی اور غیر محرم ہیں اور ایک دوسرے پر ان کے مالی حقوق و واجبات رشتۂ ازدواج کے انقطاع کے بعد از سرِ نو کسی درجے میں بھی پیدا نہیں ہو سکتے۔ جہاں تک نان و نفقہ کا تعلق ہے اسلامی شریعت میں اس کے وجوب کی چند متعین صورتیں ہیں۔ مثلاً والدین بالخصوص جب وہ محتاج ہوں، ان کا نان و نفقہ بالغ اولادِ نرینہ کے ذمہ ہے۔ اولاد جب تک نابالغ اور غیر شادی شدہ ہے اس کا نفقہ والد کے ذمہ ہے۔ بلوغ و نکاح کے بعد اگرچہ والد کا رشتۂ نسب اولاد سے منقطع نہیں ہوتا مگر والد پر اولاد کے نان و نفقہ کے قانونی حقوق ختم ہو جاتے ہیں۔ اگر مطلقہ اپنے سابق خاوند سے نفقہ یا حصہ جائداد کی حقدار ہوتی تو غریب بالغ اولاد اور بہن بھائی بدرجہ اولیٰ اس کے مستحق تھے کہ ان کو بھی نفقہ اور جائداد سے حصہ ملتا۔

کمیٹی کا اگر یہ خیال ہے کہ مطلقہ کے اس نئے مالی حق کی تخلیق سے طلاق میں کمی ہو جائے گی تو یہ خیال بھی بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ مغربی ممالک میں، جیسا کہ بیان ہوا، بالعموم مطلقہ کو خرچہ دلوایا جاتا ہے اور طلاق یا تفریق بھی عدالت ہی کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ اس کے باوجود ان ممالک میں طلاق کی بھرمار ہے۔ اور کمیٹی کے ارکان ہم سے زیادہ اس بات سے واقف ہیں کہ وہاں رشتۂ ازدواج ایک تارِ عنکبوت، ایک کچا تاگا بن کر رہ گیا ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے روزنامہ "سن" لاہور کا ۲۹ اگست کا شمارہ ہے۔ اس کے صفحہ ۹ پر آسٹریلیا کے قومی شماریات بورڈ کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۴ء تک طلاق کی تعداد میں چھیاسٹھ فی صد کا اضافہ ہوا ہے۔ اس بورڈ کے اندازے کے مطابق اس سال کے آخر تک

عدالتوں کے ذریعے سے پچاس ہزار طلاقوں کا نفاذ ہو چکا ہوگا۔ اس رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ طلاق کی رفتار میں ترقی اس امر کے باوجود ہے کہ نکاح کی شرح میں اضافہ کی بجائے کمی واقع ہو رہی ہے، کیونکہ بہت سے جوڑے اب نکاح کو ایک فرسودہ رسم سمجھتے ہیں، جب چاہتے ہیں آزادی سے یکجا ہوتے ہیں، جب چاہتے ہیں جدا ہو جاتے ہیں۔ نکاح و طلاق کے جھنجھٹ ہی میں نہیں پڑتے۔ ظاہر ہے کہ آسٹریلیا اتنا "ترقی یافتہ" نہیں ہے، جتنا کہ امریکہ، فرانس یا رُوس ہے۔ اس لیے ان ممالک کا حال آسٹریلیا سے بہتر نہیں، بلکہ بدتر ہی ہوگا چنانچہ امریکہ کے ایک رسالے اَویک (AWAKE) کے ۸ رجون ۱۹۷۶ء کے شمارے میں بتایا گیا ہے کہ گزشتہ سال وہاں دس لاکھ چھبیس ہزار طلاقیں نافذ کی گئیں اور یہ تعداد گزشتہ سالوں سے دُگنی ہے۔ گزشتہ برس کل نکاحوں کی تعداد بیس لاکھ دس ہزار ہے، گویا کہ ہر دو شادیوں میں سے ایک کا خاتمہ طلاق پر ہوا۔ مضمون نگار نے خود تسلیم کیا کہ یہ صورتِ حال عائلی زندگی کی عمومی تباہی (GENERAL BREAK DOWN OF FAMILY LIFE) کا بیّن ثبوت ہے۔ اس سے ہر پاکستانی مسلمان بآسانی یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ جو "نسوانی حقوق" یہ کمیٹی ہماری خواتین کے سر منڈھنا چاہتی ہے اس کا نتیجہ بالآخر کیا نکلے گا؟

"سر منڈھنے" کا لفظ ہم یونہی استعمال نہیں کر رہے ہیں بلکہ ہم اسے خوب سوچ سمجھ کر پوری ذمہ داری کے ساتھ استعمال کر رہے ہیں۔ ہمیں اس بات کا کامل یقین ہے کہ ہمارے ملک کی ننانوے بلکہ ساڑھے ننانوے فی صد سے بھی زیادہ خواتین صرف وہ حقوق مانگتی ہیں جو قرآن و سنّت میں مذکور ہیں، یا جنہیں فقہائے اسلام نے قرآن و حدیث سے اخذ کر کے پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ اور اس سے زائد وہ کسی شے کا مطالبہ نہیں کرتیں۔ یہ کمیٹی جس نے یہ رپورٹ تیار کی ہے اس کے ارکان پاکستانی خواتین کے ہرگز نمائندہ نہیں ہیں۔ ان میں سے بعض مرد اور عورتیں سرکاری ملازم ہیں، بعض کو مرد ارکان اسمبلی نے چُنا ہے اور بعض ایسی ہیں جو محض انگریزی اخبار نویس یا تعلیم گاہ کی صدر معلّمہ ہیں۔ پاکستان کی کسی مسلمان خاتون کو اگر نکاح یا طلاق یا وراثت یا حضانت کا کوئی خانگی مسئلہ درپیش ہو، تو وہ اس کمیٹی کے کسی ممبر کی طرف ہرگز رہنمائی کے لیے رجوع نہیں کرے گی۔ ایسی غیر نمائندہ اور نااہل کمیٹی کو آخر یہ حق کس طرح دیا جا سکتا ہے کہ وہ مسلم خواتین کے ازدواجی معاملات میں مداخلت کرے اور انہیں اس راہ پر لے جانے کی کوشش کرے جس پر وہ جانے کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔ اس طرح کی ایک ناکام اور نامعقول سعی ایوب خاں صاحب نے بھی کی تھی اور ۱۹۶۱ء میں فیملی لاز آرڈی ننس بنایا تھا جس کی رہی سہی کسر

اب موجودہ حکومت کی مقرر کردہ کمیٹی پوری کر رہی ہے۔

ہمارے فقہاء نے طلاق کے مسائل پر بحث کرتے ہوئے ضمناً یہ بات بھی لکھ دی ہے کہ اگر خاوند بیوی کو طلاق کا حق تفویض کر دے اور یوں کہہ دے کہ تو جب چاہے میری طرف سے اپنے اُوپر طلاق وارد کر سکتی ہے اور عورت اس تفویض کو قبول کر لے تو عورت اپنا یہ حق استعمال کر سکتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایوب خاں صاحب کے مارشل لاء میں جن لوگوں نے عائلی قوانین مرتب کیے تھے انہیں یہ نکتہ کہیں سے ہاتھ لگ گیا اور انہوں نے نکاح کی رجسٹریشن کے لیے جو فارم مقرر کیا اس میں اس سوال کو باقاعدہ طور پر درج کر دیا گیا کہ عورت کو نکاح کے وقت حقِ طلاق تفویض کیا گیا یا نہیں؟ یہ گویا ہر عورت کو یہ سمجھانا تھا کہ تم نکاح کے وقت اس حق کا مطالبہ کرو۔ اور اسے حاصل کر کے جب چاہو بلا تامل استعمال کرو۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے مسلم معاشرے کا بگاڑ اپنی آخری حد کو نہیں پہنچا۔ یہ قانون جوں کا توں موجود ہے لیکن نکاح کا فارم پُر کرتے وقت بالعموم اس تفویض طلاق والی شق کو قلم زن کر دیا جاتا ہے اور کوئی دلہن یا اس کا ولی اس بدعت کو پسند نہیں کرتا کہ طلاق کی باگ ڈور خاوند سے چھین کر بیوی کے ہاتھ میں دے دی جائے۔ پاکستان کی مسلمان خواتین کا تفویضِ طلاق کے حق کو مانگنے کی کوشش نہ کرنا یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ اللہ کے فضل سے ابھی تک اسلامی اقدار کا پاس اور لحاظ رکھتی ہیں۔ اور ان کی عائلی زندگی میں شریعت نے حقوق و واجبات کی جو ترتیب و تحدید مقرر فرما دی ہے وہ اس سے تجاوز کرنا نہیں چاہتیں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ "آزادیٔ نسواں" کے وکیلوں اور حامیوں نے اس سے کوئی سبق نہیں سیکھا اور وہ برابر اس بات پر مُصر ہیں کہ وہ مرد اور عورت کے مابین مودّت و موافقت کے بجائے مسابقت، طبقاتی کشمکش اور منافرت کی فضا پیدا کریں۔

ایوب خاں نے اپنے ۱۹۶۱ء والے عائلی قانون کے ذریعے سے مرد کی طلاق کو عدالتی کارروائی پر معلّق کرنے کی کوشش کی تھی۔ مزید برآں اس عائلی قانون کی دفعہ ۸ میں محض یہ گنجائش پیدا کی گئی تھی کہ جس بیوی کو خاوند نے حقِ طلاق تفویض کر دیا ہو۔ وہ عورت اس آرڈی ننس کی دفعہ ۷ کے تحت اس حق کو استعمال کر سکے گی۔ مگر اب جو ترمیم پیش کی جا رہی ہے اس کی رُو سے ہر عورت، خواہ اُسے خاوند نے حقِ طلاق تفویض کیا ہو یا نہ کیا ہو، بلا شرط و امتیاز یہ نام نہاد حق استعمال کر سکے گی اور جب وہ تنسیخ نکاح کا پروانہ عدالت کے (باقی بر صفحہ ۳۹)

(بقیہ اشارات) نام روانہ کرے گی تو عدالت کے لیے ناگزیر ہوگا کہ وہ نکاح کو زائل اور کالعدم سمجھے اور اس وقت سے اُسے کالعدم قرار دے جس وقت نوٹس کی تحریر و ترسیل عورت کی طرف سے عمل میں لائی گئی ہے۔ اس چیز کا نام حقوق نسواں کی نگہبانی کرنا نہیں، بلکہ انہیں قانون کی وساطت سے آوارگی و آبرو باختگی کی راہ پر دھکیلنا ہے۔ ایوب خان صاحب نے اپنے مارشل لاء کے دور میں مسلمانوں کے عائلی قوانین کا حلیہ بگاڑنے میں جو کسر باقی رہنے دی تھی اُسے اب ہماری "عوامی حکومت" اور اس کی مقرر کردہ کمیٹی پورا کرنے کی سعی کر رہی ہے جس کا نتیجہ معاشرتی فساد و اختلال کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔

رپورٹ کی دفعہ ۵۰ تا دفعہ ۵۵ میں جو سفارشات مرتب کی گئی ہیں ان سب کا مشترک مقصد و مفاد یہ ہے کہ کمیٹی نے سراسر غیر اسلامی و غیر عقلی بنیاد پر جس طرح یہ تجویز کیا ہے کہ طلاق دینے والے مرد کو اس امر کا مکلف بنایا جائے کہ وہ مطلقہ کو جہیز، خرچہ اور اپنی جائداد میں سے حصہ دے، اب کمیٹی چاہتی ہے کہ اس گناہ گار انسان کو چند در چند قانونی جکڑ بندیوں میں اس طرح کس دیا جائے کہ وہ جیتے جی اس شکنجے میں سے نکلنے کے قابل نہ رہے۔ چنانچہ سفارش کی گئی ہے کہ عائلی عدالتوں کو ایسے وسیع اختیارات دیے جائیں کہ جب مطلقہ عورت اپنے سابق خاوند کے خلاف واپسیٔ جہیز، خرچہ وغیرہ کا استغاثہ کرے تو عدالت فیصلے سے قبل مرد کے خلاف یہ حکم امتناعی جاری کر سکے کہ وہ اپنی جائداد کو فروخت یا کسی دوسری شکل میں کسی کے نام منتقل نہیں کرے گا۔ عدالت چاہے تو عارضی دادرسی کے طور پر مرد کی املاک کی قُرقی کا حکم بھی جاری کر سکتی ہے۔ مرد کو یہ حکم بھی دیا جا سکے گا کہ عورت کے نان و نفقہ کا استحقاق ثابت ہونے سے پہلے ہی ہر مہینے وہ عدالت میں ایک متعیّن رقم تا فیصلہ جمع کراتا رہے جو عورت کو بطور نفقہ ادا کی جائے گی۔ اگر مرد اس تاوان کی ادائیگی سے قاصر رہے تو مقدمے میں اس کا حقِ جواب دہی قطع کر دیا جائے گا اور اس کے خلاف یک طرفہ کارروائی عمل میں لائی جائے گی۔ مرد کے خلاف اس عجیب و غریب قانونی تعدّی اور دھاندلی کا جواز پیدا کرنے کے لیے دفعہ ۵۵ میں ۱۹۵۹ء کے اس قانون کی مثال دی گئی ہے جو شہری کرایہ داروں کے تحفظ کے لیے مغربی پاکستان میں نافذ ہے۔ گویا کہ میاں بیوی کا رشتہ کرایہ داری اور مکانداری کے تعلق کے مشابہ ہے! سبحان اللہ وبحمدہٖ، کیا لاجواب تشبیہ تلاش کی ہے۔ اس قانون کے تحت جب مالک مکان اور کرایہ دار کے درمیان جھگڑا ہو جاتا ہے اور کرایہ دار کرایہ دینے یا مالک کرایہ لینے سے انکار کر دیتا ہے اور مالک کرایہ دار کی بے دخلی چاہتا ہے یا کرایے میں اضافہ کا مطالبہ

کرتا ہے تو رینٹ کنٹرولر کے ہاں ایک فریق دعویٰ دائر کر دیتا ہے۔ اس کے بعد عدالت کرایہ دار کو پابند کر دیتی ہے کہ آخری فیصلہ ہونے تک وہ ایک متعین رقم بطور کرایہ عدالت میں جمع کراتا رہے۔ یہی صورت اب نکاح و طلاق کا کرایہ کنٹرول کرنے کے لیے تجویز کی جا رہی ہے۔

ہماری قطعی رائے یہ ہے کہ سفارشات کا یہ حصہ ظلم بالائے ظلم اور دوہری ناانصافی پر مبنی ہے۔ ایک ظلم تو یہی ہے کہ طلاق کے بعد مطلقہ کے لیے ایسے حقوق ایجاد کیے جا رہے ہیں جو شرعاً و اخلاقاً بالکل بے جواز ہیں، پھر ان اختراعی حقوق کی بازیابی کے لیے جو طریق کار تجویز کیا جا رہا ہے وہ بجائے خود بڑا غیر منصفانہ اور انتقامانہ ہے۔ طلاق میں ہمیشہ قصور مرد ہی کا نہیں ہوتا، عورت کا بھی ہوتا ہے۔ لیکن فرض کیا کہ مرد ہی خطاکار ہے، تب بھی خطا اور سزا میں کوئی مناسبت تو ہونی چاہیے۔ طلاق دنیا اتنا بڑا جرم تو نہیں ہے کہ اس کے پایۂ ثبوت کو پہنچنے سے پہلے ہی مرد کو اپنی املاک میں ہر قسم کے تصرفات سے روک دیا جائے، اس کی قرقی کے وارنٹ جاری کر دیے جائیں یا اُسے مجبور کر دیا جائے کہ اس کے خلاف جب تک مقدمے کا آخری فیصلہ نہ ہو وہ ایک متعین مقدار میں "کرایۂ نکاح" عدالت میں جمع کراتا رہے جو اس کی "لینڈ لیڈی" کو ادا ہونا چاہیے۔ مگر کرایہ دار جب مکان سے بے دخل ہو جاتا ہے تو اس کے بعد فریقین میں سے کسی ایک کا دوسرے پر کوئی مالی حق قائم نہیں ہو سکتا جس کی وصولی کے لیے ایک فریق کے خلاف قرقی یا انتقالِ جائداد کے امتناع کا حکم صادر کیا جائے۔ پھر کیا طلاق ہی اتنا بڑا اور سنگین جرم ہے جو ان ساری سزاؤں کا مستلزم ہو؟ کیا قرونِ اولیٰ میں کسی طلاق دینے والے کے لیے ایسی فوجداری یا دیوانی تعزیرات تجویز کی گئی تھیں؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پروردہ صحابی حضرت زیدؓ نے آنحضرتؐ کی قریبی عزیزہ حضرت زینبؓ کو طلاق دے دی تھی، حالانکہ آنحضورؐ نے فرمایا تھا کہ اپنی بیوی کو نہ چھوڑو اور خدا سے ڈرو۔ کیا اللہ اور اس کے رسولؐ نے بھی یہ حکم دیا تھا کہ زینبؓ کو اپنی جائداد کا ¼ حصہ دو یا جتنے سال نکاح پر گزرے ہیں، اتنے ماہ کا نفقہ ادا کرو؟ کیا حضرت زینبؓ نے اپنے جہیز یا نفقہ کی ادائیگی کا کوئی دعویٰ یا حضرت زیدؓ کی جائداد کی ضبطی یا قرقی کا کوئی استغاثہ بارگاہ نبویؐ میں دائر کیا تھا؟ کیا کسی مسلمان عورت کے حقوق صحابیات سے بڑھ کر ہو سکتے ہیں جن کی نشاندہی اور بازیابی کا دعویٰ آج کیا جا رہا ہے؟

اس کے بعد ہم رپورٹ کی دفعہ ۶۲ کو لیتے ہیں جس میں فریقین کے لیے عائلی عدالت سے رجوع کے بعد عدالت سے باہر مصالحت کی ایک صورت تجویز کی گئی ہے۔ وزارتِ قانون کے فراہم کردہ ترجمے کی نقل مطابق اصل درج ذیل ہے۔ اگرچہ ایسی بھونڈی عبارت کا نقل کرنا اور پڑھنا ذوقِ سلیم پر بار ہے:

"کمیٹی کا یہ خیال ہے کہ فریقین کے درمیان مفاہمت کرانے کے امکانات عدالت کے اندر کے مقابلے میں عدالت سے باہر زیادہ ہیں۔ اگر کوششیں اس علاقے کے جس سے وہ تعلق رکھتے ہوں، چند ایماندار، فارغ البال اور غیر جانب دار باعزت اشخاص کی طرف سے کی جائیں۔ ہر ایک ضلع میں ضلع جج کا ایسے اشخاص کی ایک فہرست تیار کرنا مشکل کام نہیں ہے۔ ان اشخاص کو جنہیں افسرانِ بہبود کے نام سے موسوم کیا جاسکتا ہے، عائلی عدالت کی طرف سے حکم دیے جانے پر مصالحت کنندہ کے طور پر کام کرنے کے لیے تیار کرنا چاہیے جسمیں کمیٹی کی سفارش ہے کہ:

شوہر اور زوجہ کے درمیان عدالت سے باہر مصالحت کے لیے عدالت ہائے عائلی ایکٹ میں احکام وضع کیے جائیں۔ عائلی عدالت فریقین کی طرف سے مشترکہ درخواست پر ان اشخاص میں سے کسی کو جس کا نام ضلع جج کی تیار کردہ افسرانِ بہبود کی فہرست میں موجود ہو، مصالحت کنندہ کے طور پر کام کرنے کے لیے نامزد کرے۔ بایں طور نامزد کردہ شخص کو حکم دیا جائے کہ ایک ماہ کے اندر اپنی مصالحتی کوششوں کی کامیابی یا ناکامی کے بارے میں عدالت کو رپورٹ پیش کرے"۔

رپورٹ کی اس دفعہ میں عدالت سے باہر زوجین کی جس مفاہمت کا ذکر کیا گیا ہے، اصولاً ہمیں اس سے اتفاق ہے اور خود قرآن مجید (سورۂ نساء: ۳۵) میں بھی خانگی جھگڑوں کو نمٹانے کے لیے حکمین کے تقرر کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔ لیکن رپورٹ میں تجویز کردہ صورت قرآنی ہدایات سے بالکل مختلف ہے۔ قرآن مجید کا فرمان یہ ہے کہ جہاں میاں اور بیوی میں ناچاقی ہوجائے وہاں انقطاعِ نکاح تک نوبت پہنچنے یا عدالت میں معاملہ جانے سے پہلے گھر کے گھر ہی میں اصلاح کی کوشش کرلینی چاہیے اور اس کی صورت یہ ہے کہ میاں اور بیوی ہر ایک کے خاندان میں سے ایک ایک آدمی اس غرض کے لیے مقرر کیا جائے کہ دونوں مل کر اسباب اختلاف کی تحقیق کریں۔ پھر آپس میں سر جوڑ کر بیٹھیں اور تصفیہ کی کوئی صورت نکالیں۔ اگر زوجین چاہیں تو اپنے اپنے رشتہ داروں میں سے خود ہی ایک ایک آدمی کو اپنے اختلاف کا فیصلہ کرنے کے لیے منتخب کرلیں، ورنہ دونوں خاندانوں کے بڑے بوڑھے مداخلت کرکے پنچ مقرر کردیں اور اگر عدالت میں مقدمہ پہنچ ہی جائے

تو عدالت خود کوئی کارروائی کرنے سے پہلے خاندانی ثالث مقرر کر کے اصلاح کی کوشش کرے۔

اس کے برعکس رپورٹ میں تجویز کردہ صورت یہ ہے کہ ہر ڈسٹرکٹ جج اپنے علاقے کے چند معزز اور غیر جانبدار اشخاص کی ایک مستقل فہرست تیار کرے اور عائلی عدالت جب بھی مصالحت کرانا چاہے، وہ زوجین کو حکم دے کہ وہ اسی فہرست میں سے کسی فرد کو ثالثی کے لیے منتخب کریں۔ اس فہرست ہی میں سے ثالث بنانے کی قید قرآنی حکم سے متصادم ہے اور اس سے وہ مقصد فوت ہو جاتا ہے جو حکمتِ قرآنی کے پیش نظر ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ میاں بیوی کے ذاتی اور پرائیویٹ معاملات و تنازعات صرف ایسے دو افراد کے سامنے رکھے جائیں جن میں سے ہر ایک مرد یا عورت سے قرابت داری و ہمدردی کا تعلق رکھتا ہو اور اس سے بجا طور پر یہ توقع کی جا سکتی ہو کہ وہ نازک متنازعہ فیہ مسائل کو سلجھا سکے گا۔ اور سلجھا نہ سکے گا تو کم از کم ہر فریق متعلقہ آزادی اور بے تکلفی کے ساتھ اس کے سامنے اپنے حالات بیان تو کر سکے گا۔ اس صورت میں مصالحت ہو یا نہ ہو گھریلو باتوں اور رازوں کا افشاء تو نہیں ہوگا۔ ورنہ جج جو دائمی ضلعی فہرست مقرر کر دے گا، ضروری نہیں کہ ہر میاں بیوی جس کے مابین کوئی اختلاف یا تنازعہ رونما ہو، ان کے خاندانوں کا ایک ایک معتمد علیہ فرد اس فہرست میں شامل ہو۔ ہو سکتا ہے کہ زوجین میں سے کسی ایک یا دونوں کے خاندانوں سے تعلق رکھنے والا کوئی شخص سرے سے اس فہرست میں درج ہی نہ ہو، یا ہو مگر کسی فریق کو اس کے حکم مقرر کیے جانے میں تامل و اعتراض ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میاں یا بیوی کے خاندان کا کوئی فرد اس ضلع میں موجود ہی نہ ہو جس میں مقدمہ دائر ہے بلکہ اس کے اہلِ خاندان کسی دوسرے ضلع میں رہائش پذیر ہوں۔ غرض ایسی بہت سی صورتیں ممکن ہیں جن میں کمیٹی کے تجویز کردہ طریق کار اور "افسرانِ بہبود" کی مستقل اور پیشگی مرتب کردہ فہرست سے فَابْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا کا قرآنی مقصود حاصل نہیں ہو سکے گا بلکہ اس سے مزید الجھنیں اور قباحتیں رونما ہوں گی۔ اس قسم کے "افسرانِ بہبود" کے سامنے زوجین کھل کر اور پورے اعتماد کے ساتھ کوئی ایسی بات نہیں کر سکیں گے جو وہ عدالت کے سامنے نہ پیش کر سکتے ہوں۔ اس طرح کے ویلفیئر آفیسر ہو سکتا ہے کہ حکومت یا عدالت کے لیے کچھ دوسری مفید خدمات انجام دے سکیں، لیکن یہ دیکھے بغیر کہ زوجین سے ان کا کوئی خاندانی رشتہ ہے بھی یا نہیں، بلا امتیاز انہیں ہر ازدواجی نزاع میں دخیل بنا دینا اسلامی تعلیم اور قرآنی ہدایت کے خلاف ہے۔ اور اس سے معاملات سلجھنے کے بجائے اور زیادہ الجھنے کا امکان ہے۔ اگر ثالثی کی تجویز کو قانونی شکل دینا

ضروری سمجھا جائے تو اس کے لیے ناگزیر ہے کہ ہر تنازعے یا مقدمے میں حکمین کا تقرر بطور خاص کیا جائے اور اس میں اُن شرائط و حدود کو ملحوظ رکھا جائے جو کتاب و سنت اور فقہائے اُمت نے بیان فرما دی ہیں۔

یہ سطور لکھی جا چکی تھیں کہ ستمبر ۱۹۷۶ء کا "طلوع اسلام" نظر سے گزرا جس میں اس کمیٹی کی سفارشات کو بہت سراہا گیا ہے۔ ص۵۹ پر ایک مضمون نگار لکھتے ہیں:

"معاہدۂ نکاح کے فسخ کرنے کا عورت کو اُسی طرح حق حاصل ہے جس طرح مرد کو۔ جس طرح اپنے نکاح کے متعلق فیصلہ کا حق مرد کو حاصل ہے، اس میں عدالت کی مداخلت کی ضرورت نہیں، اسی طرح اس معاہدہ کے فسخ کرنے کا فیصلہ عورت کو از خود کر لینا چاہیے، اس میں عدالت کی مداخلت کی ضرورت نہیں۔"

پھر ص۶۱ پر "طلوع اسلام" والے لکھتے ہیں:

"ان سفارشات میں بہت سے قانونی نقائص کی نشاندہی کی گئی ہے اور عورت کی کفالت کے سلسلہ میں بھی اطمینان بخش سفارشات موجود ہیں۔ لیکن نکاح طلاق سے متعلق یہی اہم سفارش ہے جس کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے یعنی عورت کے لیے یکساں حق طلاق۔ اس کے لیے اور عورتوں کے عام حقوق کے تحفظ کے سلسلے میں جو سفارشات کی گئی ہیں، ان کے لیے ہم ارباب کمیٹی کو مستحق مبارک باد سمجھتے ہیں جی چاہتا ہے کہ اس میں تعدد ازدواج کے متعلق بھی کوئی سفارش سامنے آجاتی۔ ممکن ہے اور اسی قسم کی دیگر سفارشات رپورٹ کے اگلے حصے میں درج ہوں۔"

اس تحسین و آفرین کے بعد یہ اندازہ کر لینا کچھ مشکل نہیں ہے کہ یہ رپورٹ کس طرزِ فکر اور نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتی ہے اور کن لوگوں کو خوش کر سکتی ہے۔

اب ہم دفعہ ۶۵ اور دفعات مابعد کو لیتے ہیں۔ دفعہ ۶۵، ۶۶ اور ۶۷ کی رو سے کمیٹی کے ارکان نے ایک مزید "بے رحمی" کے ازالے کی کوشش کی ہے جو ان کے خیال کے مطابق خاوند بیوی کے ساتھ روا رکھتے ہیں۔ وہ بے رحمی یہ ہے کہ "شوہر اپنی بیوی کو اس کے والدین اور دوسرے قریبی رشتہ داروں سے ملنے سے

روک کر اس کی زندگی کو اذیت ناک بنا دینا ہے" کمیٹی نے اس ظلم کو دفع کرنے کی یہ صورت تجویز کی ہے کہ اس جرم کے ارتکاب پر شوہر کے خلاف فوجداری و تعزیری کارروائی کی جائے اور مزید برآں ایسے بے رحم اور شقی القلب خاوند کے خلاف عورت کو عدالت سے فسخ نکاح کی ڈگری حاصل کرنے کا حق بھی دیا جائے۔ چنانچہ دفعہ ۶۷ میں کمیٹی نے یہ سفارش کی ہے کہ:

"جبکہ شوہر یا اس کے رشتہ دار دانستہ طور پر زوجہ کو اس کے والدین، بچوں، بھائیوں یا بہنوں سے ملنے سے روکیں، تو اسے ایسا جرم قرار دیا جائے جو تین ماہ کی مدت تک قید یا جرمانہ یا دونوں سزاؤں کا مستوجب ہو۔ مذکورہ بالا جرم کے لیے شوہر کی سزایابی کی صورت میں زوجہ اسے انفساخِ ازدواج کے لیے عذر کے طور پر پیش کر سکے گی۔"

اصولاً ہمیں اس بات سے اتفاق اور اس کا اعتراف ہے کہ اسلام نے حسنِ معاشرت اور صلۂ رحمی کے جو آداب سکھائے ہیں ان میں یہ بھی شامل ہے کہ خاوند مناسب و معقول حدود کے اندر بیوی کو اجازت دے کہ وہ اپنے قریبی اعزہ سے وقتاً فوقتاً مل سکے۔ لیکن اس حق کے استعمال و عدم استعمال کے لیے کوئی قانونی و تعزیری ضابطہ بنانے سے پہلے خاصی سوچ بچار کی ضرورت ہے۔ میاں بیوی کا رشتہ اور ان کے ازدواجی حقوق و واجبات کی نوعیت ایسی نہیں ہے کہ ان کے تعین و تصفیہ کے لیے دونوں کے پاس چند کتابچے قوانین و ضوابط کے ہر وقت موجود رہیں اور جہاں کوئی گھریلو غور طلب یا مختلف فیہ مسئلہ سامنے آئے دونوں ورق گردانی میں مصروف ہو جائیں اور اپنے جس حق کو وہ قانون کے بل پر قابلِ وصول سمجھیں اس کے لیے عدالت کا دروازہ جا کھٹکھٹائیں۔ اب آپ یہی بیوی اور اس کے رشتہ داروں کے میل ملاقات کا مسئلہ ہی لیجیے۔ اس کے کئی پہلو اور کئی صورتیں ہیں جن کا وقوع ممکن ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بیوی یہ کہے کہ میں ہر روز یا ہر دوسرے یا تیسرے روز اپنے والدین یا بھائی یا بہن سے ملنا چاہتی ہوں یا میں یہ چاہتی ہوں کہ میرے یہ قرابت دار اسی طرح اتنے ہی وقفے سے مجھے آ کر ملیں۔ بیوی یہ مطالبہ بھی کر سکتی ہے کہ میں عزیزوں سے ملنے جاؤں تو میرا شوہر مجھے لے کر جائے۔ وہ یہ بھی کہہ سکتی ہے کہ شوہر میرے ساتھ نہ جائے، مجھے تنہا جانے دے۔ اور جب تک میں چاہوں مجھے رشتہ داروں کے ہاں رہنے دے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بیوی کے رشتہ دار کسی دوسرے شہر یا دوسرے ملک میں رہتے ہوں اور بیوی یہ کہے کہ مجھے گاڑی یا جہاز میں سوار کرا دو، میں منزلِ مقصود تک پہنچ جاؤں گی۔ اب کمیٹی کے ارکان خود غور فرمائیں کہ ان ساری یا بعض صورتوں میں اگر خاوند بیچارا کچھ پس و پیش یا لیت و لعل

سے کام لے تو کیا وہ اس کا مستحق ہے کہ تین ماہ کی قید یا جرمانہ یا دونوں سزائیں بھگتے اور اس کے بعد سزا یافتہ ہونے کی بنا پر تنسیخِ نکاح کا مقدمہ اور اہلیہ کا داغ مفارقت سہنے کے لیے بھی تیار ہو جائے؟

ہماری ان گزارشات کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ بیوی اور اس کے رشتہ داروں کی ملاقات کا حق بالکل خاوند کے رحم و کرم پر موقوف ہے اور وہ جس طرح چاہے اس پر قدغن لگا سکتا ہے لیکن اسلام اور عقلِ عام کی رُو سے یہ صورتِ حال بھی پسندیدہ یا گوارا نہیں ہے کہ بیوی صاحبہ جب چاہیں خاوند کو بتا کر یا بتائے بغیر گھر سے نکل کھڑی ہوں خواہ مقصود عزیزوں سے ملاقات ہی ہو۔ غیر اسلامی معاشروں کے تہذیبی معیارات و روایات میں یہ بات بالکل معیوب نہیں ہے کہ عورت خواہ کنواری ہو یا شادی شدہ، تن تنہا یا غیر محرم افراد کے ساتھ جہاں چاہے چلی جائے۔ لیکن اسلام عورت کو اس طرح گھر سے نکل کھڑی ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ عورت تین شبانہ روز کے سفر پر شوہر یا محرم مرد کے بغیر نہ نکلے خواہ یہ سفر حج ہی کیوں نہ ہو[1]۔ اور اس سے مُراد فُقہاء نے اتنی مسافت لی ہے جو تین دن میں بآسانی پیدل طے ہو سکے۔ اب فرض کیجیے کہ میاں بیوی لاہور میں مقیم ہیں اور بیوی کے اعزّہ پشاور یا کراچی میں ہیں تو بیوی کے حقِ ملاقات سے استفادہ کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس سفر کی آمد و رفت میں اس کا خاوند یا محرم ہمراہ ہو، ورنہ میاں بیوی دونوں گناہ گار ہوں گے۔ اسی طرح اگر بیوی کے بعض رشتہ داروں کی اخلاقی حالت اور خاندانی ماحول ایسا فاسد اور فتنہ انگیز ہو کہ بیوی بچوں کا وہاں جانا اور جا کر رہنا ان کے عادات و اطوار کے بگاڑنے کا باعث بنتا ہو تو خاوند اس امر میں حق بجانب ہے کہ وہ اپنے اہل و عیال کو وہاں جانے سے روک دے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ شادی غمی کی تقریبات میں انہیں شمولیت سے نہ روکے۔ بیماری یا پریشانی میں عیادت اور خبر گیری کی اجازت دے یا سسرال کے عزیز اپنے ہاں آجائیں تو خاوند ان کی آمد و ملاقات کی راہ میں حائل نہ ہو۔ یہ تو روابط و تعلقات کے شرعی پہلو ہیں، ان کے علاوہ بعض انتظامی اور عملی پہلو بھی ہو سکتے ہیں جو قابلِ غور و لحاظ ہوں۔ مثلاً ایک پہلو یہی ہے کہ بیوی کے قریبی عزیز اگر کسی دور دراز مقام پر ہیں تو خاوند کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ

---

[1] بخاری شریف اور دیگر کتب احادیث میں ارشاد نبوی وارد ہے کہ جو عورت اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہو، اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ تین دن رات کا سفر بغیر محرم کے کرے۔ بخاری ہی کی دوسری حدیث میں تین کے بجائے ایک دن رات کے الفاظ بھی مروی ہیں۔

وہ آئے دن اپنے سارے کام چھوڑ کر محض ملاقات کے لیے اہلیہ کو ملوانے لے جائے، پھر واپس لائے، دو طرفہ اخراجاتِ سفر برداشت کرے ورنہ جیل کی ہوا کھائے۔

اس لیے کمیٹی کے اصحابِ دانش و بینش سے ہماری یہ گذارش ہے کہ بیوی کا اس کے رشتہ داروں سے حقِ ملاقات تو مسلّم ہے مگر اس کے لیے یا تو تعزیری و فوجداری ضابطہ نہ بنائیں اور سردست اسے زوجین کے احساسِ مروّت و مودّت (GOOD SENSE) ہی پر چھوڑ دیں یا پھر قانونی ضابطہ بنانا ہی چاہیں تو ہمارے بیان کردہ مذکورۂ بالا اُمور کو پیشِ نظر رکھ کر بنائیں تاکہ فریقین میں سے کسی کو بھی دِقّت و دشواری کا سامنا نہ ہو۔ اگر خاوند کے لیے سزا اور تین ماہ قید کی حد مقرر کرنا آپ کے نزدیک روا ہے تو بیوی کے لیے عزیزوں سے ملاقات کی بھی کوئی حد ہونی چاہیے۔ فقہاء نے ملاقات سے روکنے کو تعزیری جرم تو نہیں بنایا تھا، لیکن انہوں نے بیوی کے حقِ ملاقات کی تصریح کرتے ہوئے اس کی مناسب و معروف طریق پر تحدید کی ہے۔ مثلاً انہوں نے فرمایا ہے کہ شوہر بیوی کو والدین اور بہن بھائیوں کے ہاں جانے سے اور انہیں اپنے ہاں آنے سے نہ روکے، مگر یہ آمد و رفت ایک دستور کے مطابق ہو۔ اگر سب ایک ہی بستی میں مقیم ہوں تو ہفتے میں ایک مرتبہ اور متفرق شہروں میں ہوں تو سال میں ایک یا دو مرتبہ ملاقات کی اجازت ہونی چاہیے۔

بہرکیف اگر حقوقِ نسواں کمیٹی کو حقِ ملاقات کے لیے قانون وضع کرنے پر اصرار ہی ہے تو شرعی و عقلی بنیاد پر اس کے لیے کچھ حدود و قیود کی تعیین ضروری ہوگی۔ اس کے بعد اگر ملاقات سے روکنے پر خاوند کو تین ماہ تک کی سزا بھی لازم سمجھی جائے تو ہماری درخواست یہ ہے کہ خاوند کو جیل بھیجنے کے بجائے اُسے اپنے ہی گھر میں "پابندِ مسکن" بنا کر رکھنے کی سزا دی جائے اور بیوی اور جس رشتہ دار سے ملاقات میں خاوند حائل ہوا ہے انہیں اس بات کا نگران مقرر کیا جائے کہ خاوند گھر سے باہر قدم نہ رکھنے پائے، اگر وہ ایسا کرے تو مفرور قیدی یا حوالاتی کے مانند اس کی سزا میں اضافہ کر دیا جائے۔ ہمارے ناقص خیال کے مطابق اس طرح انصاف کے مقاصد و مقتضیات زیادہ بہتر طریق پر پورے ہو سکیں گے۔ خاوند کے لیے قید کے بجائے یا قید کے علاوہ جو جرمانہ تجویز کیا گیا ہے، ہمارا مشورہ یہ ہے کہ اُسے خزانہ میں داخل کرنے کے بجائے بیوی اور اس کے رشتہ داروں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس کے ساتھ کمیٹی اس امر پر بھی غور فرمائے کہ بیوی اگر الگ گھر بنانے کا مطالبہ کرے اور اس گھر میں شوہر کے والدین اور بھائی بہنوں کے آنے پر ہنگامہ برپا کر دے اور پورا گھر سر پر اُٹھا لے

تو اس پر بھی کوئی تعزیر و تادیب قانوناً جائز و مناسب ہو گی یا نہیں؟

دفعہ ۶۵ کے بعد رپورٹ کی دفعہ ۶۸، ۶۹ میں طلاق کے بعد نابالغ اولاد کی حضانت و تحویل کے مسئلے کو لیا گیا ہے۔ رپورٹ کے بقول:

"نابالغ بچوں کی ولایت یا تحویل کے مقدمے میں ماں کے دعوے کو باطل کیا جا سکتا ہے اگر یہ ثابت ہو جائے کہ وہ غیر اخلاقی زندگی گزار رہی ہے یا بُرے کردار کی عورت ہے۔ بدقسمتی سے عورت کے خلاف یہ عذر ان مقدمات میں مسلسل پیش کیا جاتا ہے جبکہ کوئی تنازعہ بچوں کی تحویل کی نسبت ہو۔ صرف چند صورتوں میں بدچلنی یا بدکرداری کے الزامات ثابت ہوتے ہیں اور زیادہ تر یہ الزامات جھوٹے ثابت ہوتے ہیں اور عورت کی شہرت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچتا ہے۔ ایسے مقدمات میں عدالت عموماً کوئی کارروائی نہیں کرتی گو اسلام میں عورت پر بدچلنی کی جھوٹی تہمت لگانے کی مذمت کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں سورۂ نور کی آیت ۴ کا حوالہ پیش کیا جاتا ہے"۔

ان مقدمات میں عورتوں کے خلاف جھوٹے الزامات پر پابندی عائد کرنے کی غرض سے کمیٹی نے یہ سفارش کی ہے کہ:

"بچوں کی تحویل سے متعلق مقدمات میں اگر کسی عورت کی پاکدامنی یا کردار پر الزامات عائد کیے جائیں اور اگر ایسے الزامات جھوٹے ثابت ہوں تو عدالت کو یہ اختیار ہونا چاہیے کہ وہ متعلقہ فریق کو اظہار وجوہ کا موقع دینے کے بعد چھ ماہ کی مدت تک قید محض یا جرمانہ یا دونوں سزائیں دے سکے"۔

اس بات سے انکار کی تو گنجائش ہی نہیں ہے کہ کسی مسلمان عورت یا مرد کے خلاف جھوٹی تہمتِ زنا (قذف) گناہ کبیرہ ہے۔ لیکن عدالتوں میں ایسی تہمتیں عائد کرنے کی وجہ اور اس کے انسداد کے لیے جو سفارش کمیٹی نے کی ہے، ان دونوں سے ہمیں اتفاق نہیں ہے۔ فریقینِ مقدمہ ایک دوسرے کے خلاف ایسی گھناؤنی تہمتیں آسانی سے محض اس وجہ سے لگا دیتے ہیں کہ بدقسمتی سے ہمارے ہاں ابھی تک زنا اور قذف سے متعلق حدودِ شرعیہ کا نفاذ نہیں ہو سکا۔ اور جب تک زنا پر رجم یا سو کوڑے اور جھوٹی تہمتِ زنا پر اسّی کوڑے کی سزا سرزمین پاکستان میں نافذ و جاری نہ ہو گی اُس وقت تک اس صورتِ حال کی کلّی اصلاح نہیں ہو سکے گی جو کمیٹی کے پیش نظر ہے۔ نفاذِ شریعت سے ہماری اس محرومی اور بدنصیبی کا دور جب تک ختم نہیں ہوتا، اس وقت

تک ہمارے نزدیک زیر بحث مقدمات میں طلاق دہندہ اور مطلقہ ایک دوسرے کے خلاف جو الزام تراشی کرتے ہیں اس کی روک تھام کے لیے سردست یہی کافی ہے کہ فریقین پر قانونی بندش لگادی جائے کہ وہ بچوں کی حضانت و تحویل کے مقدمات میں ایک دوسرے پر بداخلاقی و بدکرداری کے ایسے الزامات نہ لگائیں جن کا صراحۃً یا کنایۃً تعلق فریق ثانی کی عصمت و عفت سے ہو، ورنہ ایسے استغاثے کو ناقابلِ سماعت قرار دے دیا جائے۔ ہمارے نزدیک یہ صورت بے حد افسوسناک بلکہ شرمناک ہے کہ عدالت میں زنا کا الزام سچا ثابت ہو یا جھوٹا دونوں صورتوں میں اس پر قرآنی و شرعی حد کو چھوڑ کر کوئی دوسری سزا دی جائے یا مجرم کو کوئی سزا ہی نہ دی جائے۔ زنا بالرضا تو ہمارے ہاں کوئی جرم ہی متصور نہیں ہوتا۔ حال ہی میں ایک کالج کے اساتذہ جو الزامِ زنا میں ماخوذ ہیں، ان میں سے بعض کی طرف سے یہی صفائی پیش کی گئی ہے کہ اگر فریقین نے باہمی رضامندی سے اس کا ارتکاب کیا ہے تو قانون کی نگاہ میں یہ کوئی جرم نہیں ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ شریعت کے ساتھ ایسا سنگین استہزاء کم از کم حدودِ عدالت میں نہیں ہونا چاہیے۔ (باقی)

(بقیہ رسائل و مسائل)

بالعموم علمائے سلف کے متعدد اقوال میں سے کسی ایک قول ہی کو اختیار کرتے ہیں۔ ان مسائل میں تفرد و شذوذ اگرچہ ممنوع و حرام نہیں، تاہم اس کے حق میں بڑے مضبوط اور وزنی دلائل کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن مولانا کا طریقہ یہ ہے کہ وہ مطالعہ اور غور و فکر کے بعد مختصراً اپنی تحقیق بیان کر دیتے ہیں۔ یہاں تو حضرت قتادہ کا حوالہ دے دیا ہے لیکن اکثر مقامات پر وہ یہ ذکر نہیں کرتے کہ اسلاف میں سے کس کس نے وہی بات کہی ہے اور اور یہ عدمِ ذکر اس اعتماد پر ہوتا ہے کہ اہل علم اصل مراجع و مآخذ تک دسترس رکھتے ہیں اور وہ خود ہی مسائل کی چھان بین کر لیں گے۔ لیکن سہل انگاری یا معاصرانہ چشمک سدِّ راہ بن جاتی ہے اور بعض لوگ خواہ مخواہ بحث و نزاع میں منہمک ہو کر اپنا اور دوسروں کا وقت غیر ضروری ردّ و کد میں کھپاتے رہتے ہیں۔